مستقبل کے مسائل کا عادلانہ حل تجویز کر سکیں۔

یہ کام کسی ایک فرد کے کرنے کا نہیں بلکہ اس عظیم فکری محاذ پر ہمیں ہر شعبۂ علم سے افراد کو مدعو کرنا ہو گا، ایک اجتماعی فکری محاذ بنانا ہوگا جو اپنی اخلاقی قوت (global moral force) کے سہارے اسلام کی دی ہوئی فکر کو بلا جھجک پیش کر سکے۔

اسی دوران جب مغرب اور اسلام کا زیرِ نظر شمارہ اپنے تکمیلی مرحلے میں تھا، ہمارے ایک قابل قدر دوست اور مترجم جناب محمد نسیم فاروقی قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے ہیں۔ جناب فاروقی کا ایک ترجمہ شدہ مضمون تازہ پرچے میں بھی شامل ہے۔ اُن کی رحلت ہمارے لیے ایک بڑا نقصان ہے ہم ان کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے دعا گو ہیں اور ان کے سوگواران کے ساتھ شامل ہیں۔ انا للہ و انا الہ راجعون o

بن لادن سے دُور — امریکی خارجہ پالیسی کی تشکیل

سٹیفن ایم والٹ*

ترجمہ: محمد ایوب منیر

امریکہ کی خارجہ پالیسی کی تاریخ میں انتہائی تیز رفتار ڈرامائی تبدیلی کا آغاز عالمی تجارتی مرکز کی دہشت گرد حملوں میں تباہی اور وزارت دفاع کی عمارت (Pentagon) کے نقصان سے ہوا۔ ۱۰ ستمبر ۲۰۰۱ء تک کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، عالم گیر دہشت گردی کے خلاف ایک جامع مہم کا بیڑا اٹھانے جارہی ہے۔ دراصل چند ہمہ پہلو معاہدوں سے واضح بیزاری اور دفاعی میزائل پر مستحکم پالیسی کے سوا، جارج ڈبلیو بش اور اس کی انتظامیہ کی خارجہ پالیسی کی ترجیحات سابق حکومتوں کی ترجیحات سے اساسی طور پر مختلف نہیں تھیں۔ شمالی اوقیانوس معاہدہ تنظیم ناٹو کی مسلسل وسعت پذیری کی بش نے پہلے ہی تائید کر دی تھی، بلقان میں امریکی فوجی دستوں کی تعینات پر بھی بددلی سے رضامند ہوا، روس اور چین سے چوکس رہتے ہوئے عہد و پیمان کی موجود پالیسی کا اثبات کیا اور عالمی منڈیوں کی آزاد پذیری کے لیے مزید کوششوں پر زور دیتا رہا۔ بنیادی طور پر بش انتظامیہ کی کوشش یہ رہی کہ توجہ داخلی امور پر مرکوز رکھی جائے، نئے عالمی محرکات واضح طور پر عنقا تھے۔

خارجہ پالیسی کا یہ وطیرہ ۱۱ ستمبر کو بھک سے اڑ گیا۔ اصلاحِ تعلیم اور ٹیکس رعایت کی بجائے، دہشت گردی کے خلاف جنگ نے انتظامیہ کے غالب ایجنڈے کی شکل اختیار کر لی۔ امریکہ نے فوری طور پر حملوں کا سراغ القاعدہ سے جا ملایا جو اسلامی انتہا پسندوں کا نیٹ ورک ہے جسے سعودی جلاوطن باشندہ اسامہ بن لادن چلا رہا تھا۔ اس تنظیم کے سرغنے ۱۹۹۶ء سے افغانستان سے کاروائیاں منظم کر رہی تھی۔ جب افغانستان کی طالبان حکومت نے اسامہ کی گرفت کے امریکی مطالبے کو درخور اعتنا نہ سمجھا تو امریکہ

---

* Stephen M. Walt, "Beyond Bin Ladan: Reshaping US. Foreign Policy", *International Security*, Winter 2001/02, Vol 26 No. 3, pp - 56-58.

نے القاعدہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے طالبان ہی کا تختہ الٹنے کی فوجی کوششیں شروع کر دیں۔ امریکہ نے مسلسل سفارتی مہم کے ذریعے بیرونی تائید بھی حاصل کرنا شروع کر دی تا کہ ''عالمی پہنچ رکھنے والی'' باقیماندہ دہشت گرد تنظیموں کا قلع قمع کیا جا سکے۔ امریکی اہلکاروں نے اس پر زور دیا کہ یہ مہم طویل دورانیے کی ہوگی اور اس امکان سے بھی باخبر کر دیا کہ مشتبہ دہشت گردوں کے نیٹ ورک کے خلاف فوجی کارروائی القاعدہ اور اس کے طالبان میزبانوں پر ابتدائی حملوں کے بعد بھی جاری رہ سکتی ہے۔

اس مضمون میں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم نے امریکہ کی خارجہ پالیسی کے وسیع ایجنڈے کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ بنیادی طور پر مصنف نے سفارتی پہلوؤں کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے اور فوجی حکمت عملی (Strategy) داخلی دفاع یا سراغ رسانی کے بہتر نظام کی ضرورت کا تفصیلی احاطہ نہیں کیا۔ یہ نکات بھی اہم ہیں لیکن اس مضمون کی حدود سے باہر ہیں۔

اس مضمون میں بات کو تین مراحل میں س آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلے حصے میں اس پہلو کو زیر غور لایا گیا ہے کہ ۱۱ ستمبر کے وقعات سے ہمیں امریکہ کے مقام و مرتبہ کے بارے میں کیا معلومات ملتی ہیں اور امریکہ کی آئندہ خارجہ پالیسی کے حوالے چار سبق کیا ہیں، جو خارجہ پالیسی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

دوسرے حصے میں یہ بتانے کی کوشش ہے کہ دہشت گردی کے خلاف مہم کے دوران خارجہ پالیسی کا ایجنڈ اور میانی مدت کا ہو، امریکہ کون سی نئی پالیسیاں لے کر چلے، پہلے سے جاری کون سے اہداف ہیں کہ جنہیں نظر انداز یا کم اہم کر دینا مناسب ہے۔

تیسرے حصے میں طویل مدتی اطلاعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مرکزی نکتہ بحث یہ ہے کہ آیا امریکہ تیار ہو جائے گا کہ عالمی معاملات میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے اضافی اخراجات برداشت کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا موجودہ مہم کی کامیابی اور اس پر دارومدار ہے کہ آیا اپنے بڑھتے ہوئے غالب کردار کو امریکہ دوسری ریاستوں کے لیے زیادہ قابل قبول بنا سکے گا۔

۱۱ ستمبر سے ہم نے کیا سیکھا؟

امریکہ پر حملے نے نہ صرف عالمی سیاست کے ہر پہلو کو متاثر کیا بلکہ اس نے امریکی خارجہ پالیسی

کے ان پہلوؤں کو بھی نشان زدہ کر دیا کہ جنہیں موجودہ سالوں میں بہت کم توجہ ملی۔ القاعدہ کے خلاف موجودہ جنگ لڑنے اور دہشت گردی کے مجموعی خطرے کو کم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل سبق فائدہ مند رہیں گے۔

سبق نمبر ا۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی مفت نہیں بنتی۔ عشرہ ۱۹۹۰ء کے ابتدائی سالوں سے امریکی قائدین نے ایسا طرز عمل اختیار کیا ہے گویا امریکہ بلند بانگ خارجہ پالیسی اہداف اہم قربانیاں دیئے بغیر حاصل کر سکتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ عوام نے بھی اس نقطہ نظر کو اختیار کر رکھا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے اور مابعد جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی معاملات کو کم اہمیت دی گئی ہے۔

دنیا کی مجموعی پیداوار کی ایک چوتھائی پر مبنی معیشت اور اگلے سات ممالک کے مجموعی دفاعی اخراجات کی صلاحیت نیز دو سمندروں کے حصار (خندق) کی بدولت یہ خیال حیران کن نہیں۔ امریکی محسوس کرتے تھے کہ وہ نسبتاً امن وسکون کی حالت میں کردار ادا کرتے رہیں گے۔

سرد جنگ میں امریکہ کی کامیابی سے یہ احساس طمانیت بڑھتا چلا گیا اور گزشتہ دس برس میں اس کو تقویت ملتی رہی۔ اگرچہ امریکی مسلح افواج غیر معمولی حد تک مصروف رہی ہیں لیکن ان سرگرمیوں کی وسائل و افراد کی صورت میں قیمت امریکہ کے لیے بہت کم رہی۔ ۱۹۹۱ء کی جنگ خلیج میں اتلاف جان اندازے سے انتہائی کم رہا۔ امریکی فضائیہ گزشتہ دس برسوں سے ممنوعہ پرواز علاقے (no fly zone) کی عراق میں نگرانی کر رہی ہے اور وقفے وقفے سے بمباری بھی کرتی رہی ہے۔ تاہم دس برس کے طویل عرصے میں اسے ایک ہوائی جہاز کا نقصان بھی اٹھانا نہیں پڑا۔ ہیٹی، صومالیہ، بوسنیا اور کوسووا میں امریکی مداخلت کے نتیجے میں مجموعی طور پر پچاس امریکیوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔

قابل تعریف عسکری کامیابیوں کا یہ ایک ریکارڈ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایقان بھی پختہ ہوتا چلا گیا کہ امریکہ کی حکومت بہت زیادہ خون بہائے اور ذاتی سرمایہ خرچ کیے بغیر معاملات دنیا چلا سکتی ہے۔ امریکہ دشمن دہشت گردوں نے بیرونی علاقوں میں امریکی افواج پر کئی شدید اور مہنگے حملے کیے (تازہ ترین واقعہ امریکی بحری جہاز پر اکتوبر ۲۰۰۰ء میں ہونے والا حملہ ہے) لیکن اس سے پہلے امریکی سرزمین پر دہشت گردی کے واقعات بے انتہا نقصان پہنچانے سے قاصر رہے بلکہ عوام کی یک جہتی اور دل جمعی کا

باعث بنتے رہے۔ ۱۹۹۰ء کا عشرہ بھی اقتصادی نشوونما کو سنبھالنے کا دور تھا جس نے امریکہ میں از سرنو ذاتی اعتماد پیدا کیا اور امریکہ کے لیے آسان ہو گیا کہ عالمی دباؤ کو اقتصادی گھاٹے کے احساس کے بغیر برداشت کر لے۔

۱۱ ستمبر کو القاعدہ نے بہرحال یہ واضح کر دیا کہ عالمی معاملات میں امریکہ کو شمولیت کی قیمت کہیں زیادہ ادا کرنا پڑی ہے جتنا کہ اہل امریکہ نے سوچ رکھی تھی۔ بے حد وحساب عسکری برتری اور طاقتور اقتصادی اساس کے باوجود، امریکہ نرم چارہ ثابت ہوا۔ آئندہ امریکہ کو اس سے بھی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑے گی اگر القاعدہ یا ایسے ہی دوسرے ظالم گروہ مہلک ہتھیاروں (مثلاً جوہری ہتھیاروں) تک رسائی حاصل کر لیں یا انتھراکس کے حملے جو اکتوبر ۲۰۰۱ء میں شروع ہوئے، اس کا ایک آغاز ثابت ہوں۔ خطرے کو قابل برداشت رکھنے کے لیے امریکہ کو اضافی قیمت چکانا پڑے گی چاہے بعد میں ہونے والے حملے ناکام ہی ہو جائیں۔ اس سے پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ امریکہ اب مزید یہ فرض نہیں کر سکتا کہ یہ عالمی پیمانے پر کوئی قیمت ادا کیے بغیر مفت اپنے اثرات برقرار رکھ سکتا ہے۔

سبق نمبر ۲۔ امریکہ اس سے کم مقبول ہے جتنا کہ اس کا خیال ہے۔ امریکی بڑی مستعدی سے یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا ملک پہاڑی پر روشن شہر کی مانند ہے (صدر رونالڈ ریگن یہی کہا کرتے تھے) اور عموماً یہ فرض کر لیتے ہیں کہ دوسرے معاشرے امریکہ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں اور اس کے عالمی کردار کی تحسین کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ۱۱ ستمبر کے حملوں پر جو ردعمل سامنے آیا اس سے امریکہ کے مقام سے دنیا کی لاتعلقی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک انتہا تو یہ ہے کہ دہشت گرد تنظیمات مثلاً القاعدہ امریکہ اور اس کے عالمی ایجنڈے پر ردعمل ظاہر کر کے نیا جذبہ حاصل کرتی ہیں۔ امریکہ دشمنی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسے ایک بدعنوان اور بے خدا معاشرہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس جلتی آگ کو تیل اس طرح بھی فراہم ہوتا ہے کہ امریکہ کے اسرائیل سے بے انتہا قریبی تعلقات ہیں۔ قدامت پرست عرب حکومتوں کی یہ حمایت کرتا ہے اور عراق کے ساتھ اس کی لڑائی ختم ہونے نہیں آتی۔

امریکہ کی مخالفت میں سب سے بڑھ کر حصہ لینے والوں کی نظر میں امریکہ عالمی شاطر ہے اور اسلامی دنیا میں اس کی اکڑ بازی کسی بھی طریقے سے ختم کی جانی چاہیے۔ اگرچہ عربوں اور مسلمانوں کی

واضح اکثریت القاعدہ کے طور طریقوں سے برات کا اظہار کرتی ہے اس کے باوجود عرب اور اسلامی دنیا میں امریکہ کے بارے میں معاندانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں عربوں کی حمایت نسبتاً محدود رہی ہے۔ علاوہ ازیں افغانستان کے ہمسائے اپنی سرزمین سے امریکی افواج کے لیے غیر محدود رسائی دینے سے متامل رہے۔

امریکہ کے کردار کے بارے میں تحفظات عالم عرب یا عالم اسلام تک محدود نہیں ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں روس، چین اور بھارت نے امریکہ پر الزام عائد کیا کہ وہ ان کے مفادات نظر انداز کر رہا ہے اور اپنی ہی ترجیحات کو ساری دنیا کے سر لاگو کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے ہی تفکرات کے باعث چین اور روس نے ۲۰۰۱ء میں دوستی کا معاہدہ کیا جس کو ایک روسی تجزیہ نگار نے امریکہ کے خلاف معاہدہ دوستی قرار دیا۔ حتیٰ کہ امریکہ کے روایتی حلیف ممالک امریکہ کے ہاتھوں میں قوت کے ارتکاز، واشنگٹن اور یک رخی پرواز کے بارے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کر چکے ہیں اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ امریکہ کے کردار کو محدود کرنے کے لیے ذرائع تلاش کریں۔ ان میں سے کئی ایک ممالک امریکہ کی عالمی موجودگی کے اثرات سے جو استحکام پیدا ہوتا ہے اس کی تعریف کرتے ہیں تاہم وہ بھی اپنی مرضی دوسروں پر تھوپنے کی واشنگٹن پالیسی کی مزاحمت کرتے ہیں اور فکرمند ہیں کہ واشنگٹن اپنی قوت کا کہیں نہ کہیں غلط استعمال کرے گا۔

جڑواں ٹاور کے گرنے سے یہ خدشات غائب نہیں ہوئے ہیں۔ اگرچہ ۱۱ ستمبر کے حملوں کے پس منظر میں امریکہ کو کافی حد تک عالمی ہمدردی ملی ہے لیکن جو حمایت اسے ملی ہے وہ غیر مشروط نہیں ہے اور امریکہ کے اہم ترین حلیفوں تک نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ امریکی ردعمل محدود ہی رہے۔

امریکہ کے اتحادی اس حوالے سے بھی فکرمند تھے کہ امریکہ عراق پر حملہ کرنے کے موقع کو بھی جھپٹ لے گا۔ یورپی یونین کے چند سربراہان مملکت نے اس پر زور دیا کہ امریکی ردعمل ''مناسبت'' سے ہونا چاہیے۔ اسی طرح ناٹو کا فیصلہ کہ ناٹو معاہدہ کی شق ۵ کا اجراء کیا جائے اور اس ذریعہ سے ۱۱ ستمبر کے واقعات کو تمام ناٹو ممالک پر حملہ تصور کیا جائے۔ اہل یورپ کا یہ اصرار بھی شامل تھا کہ اقدام کرنے سے

پہلے امریکہ اپنے اتحادیوں سے صلاح مشورے کرے۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بین الاقوامی امداد جو امریکہ کو مل جاتی ہے اس کی گہرائی کو مبالغہ آمیز انداز میں نہ پیش کیا جائے۔ دوسری ریاستوں نے امریکہ کی پشت پناہی کی ہے اور اس پر ان کا اتفاق ہے کہ دہشت گردی ایک خطرہ ہے اور یہ بھی کہ واشنگٹن نے واشگاف انداز میں کہہ دیا ہے کہ ''غیر جانبداری'' کوئی انتخاب (option) نہیں ہے اور اس حادثے کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کر لیں۔ اسی لیے روس، دفاعی میزائل کے بارے میں ایک معاہدہ کو عملی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کے بدلے میں چیچنیا میں ''اسلامی دہشت گردوں'' کے خلاف اپنی مہم میں امریکہ کی رضامندی بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان نے اہم اقتصادی رعایات حاصل کر لی ہیں اور ازبکستان، سلامتی کی ضمانت پر سودے بازی کر چکا ہے۔ لیکن افغانستان میں امریکی پالیسی کی حمایت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری ریاستیں امریکہ کے ساتھ حالت سکون میں ہیں یا یہ کہ دیگر معاملات میں وہ امریکہ سے اتفاق کرتے ہیں۔ اگر امریکہ کے قائدین یہ فرض کر لیں کہ بین الاقوامی حمایت کی موجود لہران کو دوسری ریاستوں کے مفادات کو نظر انداز کرنے کے قابل بنا دے گی، تو وہ امریکہ کے سفارتی احترام (protocol) میں قابل قدر کمی کر دیں گی اور خطرے کے ٹلتے ہی ردعمل بھی ظاہر کریں گے۔

سبق ۳۔ ناکام ریاستیں قومی سلامتی کا مسئلہ بن جاتی ہیں۔

حکومتیں جب ناکام ہو جائیں تو لاقانونیت جنم لیتی ہے جس کے نتیجے میں ہجرت، معاشی ابتری اور برہنہ تشدد وجود میں آتا ہے۔ اس کے اثرات عموماً قریبی ممالک تک سب سے پہلے پہنچتے ہیں۔ ناکام ریاستوں کا چیلنج عموماً انسانی ہمدردی کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً صومالیہ، سیرالیون، لائبیریا، روانڈا اور افغانستان نیم دلی پر مبنی عالمی ردعمل عموماً جزوی طور پر کامیاب ہوتا ہے۔

۱۱ ستمبر کے واقعات نے واضح کر دیا ہے کہ ناکام ریاستیں صرف ایک انسانی المیہ نہیں بلکہ وہ قومی سلامتی کا ایک بڑا مسئلہ بھی بن سکتی ہیں۔ افغانستان کے طویل معاشرتی انتشار نے طالبان حکومت اور القاعدہ تحریک کو پروان چڑھایا۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے سے بن لادن ناکام ریاستوں کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ گزشتہ دہائی میں افغانستان میں زیادہ باصلاحیت اور جدت پسند حکومت برسر اقتدار آ

چکی ہوتی تو بن لادن کو وہاں ہرگز جائے پناہ میسر نہ آتی اور ممکن تھا کہ امریکہ پر حملے بھی نہ ہوئے ہوتے۔

چند ریاستوں کی بدولت جو خطرات سامنے آئے ہیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ حل طلب مخاصمت بعد ازاں حقیقی خطرے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ طوالت اختیار کرنے والے جھگڑے اور انتشار، نفرت اور انتقام کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں۔ نتیجتاً ایسے ضمنی گروہ وجود میں آ جاتے ہیں کہ جو چاہتے ہیں کہ جنگ بہرحال جاری رہے۔ اس فضا سے ان سربراہوں کو تقویت ملتی ہے جن کے وجود کی بقا کے لیے خوف اور سراسیمگی کا ماحول سازگار ہوتا ہے۔ ان حالات میں ایسے لوگوں کے معرض وجود میں آنے کا بہترین ماحول فراہم ہو جاتا ہے جو جان بوجھ کر عوامی قتل عام میں افغانستان، کشمیر، مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں طوالت پکڑنے والے جھگڑوں کے سبب ہی وجود میں آئے۔ بالکل ممکن ہے کہ ۱۱ ستمبر کو امریکہ پر حملے ہوئے ہی نہ ہوتے اگر پرتشدد جنگ کسی نتیجہ تک پہنچ چکی ہوتی لہٰذا طول پکڑ جانے والے سیاسی و معاشرتی انتشارات کا حل ہونا نہ صرف دنیا کے لیے بہتر ہے بلکہ اس سے امریکہ بھی زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔

سبق ۴: آخری بات یہ ہے کہ دہشت گرد حملوں پر امریکہ نے جو ردعمل ظاہر کیا ہے وہ ایک قومی یاددہانی ہے۔ حتیٰ کہ ایک عالمی طاقت کو بھی دوسرے ممالک کی حمایت درکار ہوتی ہے۔ برسراقتدار آنے کے ابتدائی چند مہینوں میں بش انتظامیہ نے ایسا طرز عمل اختیار کیا گویا دوسرے ممالک کی آراء چنداں قدر و قیمت کی حامل نہیں ہیں۔ اس رویے کا مظاہر دفاعی میزائل کی حمایت اور کئی بین الاقوامی طور پر نمایاں معاہدوں کو اجڈ طریقے سے رد کرنے پر ہوا۔ اگرچہ ان پالیسیوں پر اندرون و بیرون ملک شدید تنقید ہوئی لیکن ایسی کوئی علامت موجود نہیں کہ بش انتظامیہ ۱۱ ستمبر سے پہلے اپنی اساسی سوچ پر غور و فکر کرنے جا رہی تھی۔

جیسے ہی امریکہ پر حملہ ہوا، بش انتظامیہ کو اچانک معلوم ہوا کہ عالمی حمایت ناگزیر ہے۔ القاعدہ کے خلاف عسکری جدوجہد متقاضی ہے کہ بیرونی سرزمین تک رسائی ہو، بیرونی فضا کو استعمال کرنے کی اجازت موجود ہو اور جیسا کہ آگے بحث آ رہی ہے کہ دور دراز علاقوں تک پھیلے ہوئے دہشت گردی کے جال ختم کرنے کی جدوجہد دوسرے ممالک کی واضح اور بااعتماد حمایت کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ وسیع البنیاد عالمی حمایت نے القاعدہ اور طالبان کے خلاف جدوجہد کو قانونی بنا دیتی اور دوسروں کے اس

میلان کو بھی کم کر دیتی جو سمجھتے ہیں کہ امریکہ ایک انتظام پر (trigger happy) استعماری قوت ہے مخفی طنز واضح ہے۔ ایک صدر جس کی خارجہ پالیسی کے بارے میں سوچ واضح طور پر یک سمتی (unilateral) تھی اب اس کی صلاحیت کا اس حساب سے جائزہ لیا جا رہا ہے کہ کیا وہ غیر معمولی عالمی حمایت حاصل کر لے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بش ٹیم نے تیزی سے راستہ تبدیل کر لیا اور بیرونی طاقتوں کی حمایت حاصل کرنے کے شاندار کام کا آغاز کر دیا۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ حمایت کمزور پڑ جائے گی تاہم اگر افغانستان کی لڑائی طول پکڑتی ہے اور امریکہ، طالبان کی جگہ قابل قبول حکمران اتحاد لانے میں ناکام رہتا ہے تو دہشت گردی کے خلاف اتحاد کو برقرار رکھنا ایک بڑا چیلنج بن جائے گا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ

امریکہ کی خارجہ پالیسی کے مضمرات کا جائزہ اگر خالصتاً انسانی پیمانے پر لیا جائے تب بھی امریکہ کو جو نقصان آج تک پہنچا ہے اس سے اس کی اقتصادی معیشت اور اس کے خالص قومی مفادات متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ امریکہ ابھی تک دنیا کی سرکردہ اقتصادی اور عسکری قوت ہے اور دہشت گردی کے بارے میں عالمگیر اتفاق رائے کہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کے سبب امریکہ کے اثرات میں قلیل مدت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اہداف تا حال غیر متاثر ہیں۔ امریکہ ابھی تک چاہتا یہی ہے کہ یورپ اور ایشیا کے مابین دفاع کے مسئلے پر مقابلہ بازی نہ ہو، عناد پر مبنی بڑی طاقتیں ظہور پذیر نہ ہوں، کھلی منڈی کی معیشت پروان چڑھے، اجتماعی تباہی کے ہتھیار (WMD) کی تیاری میں کمی ہو، نیز جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے احترام میں اضافہ ہو جائے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ بالکل نیا ہدف نہیں ہے چونکہ امریکہ اور القاعدہ ماضی میں کئی بار ایک دوسرے پر حملہ آور ہو چکے ہیں۔

ان مختلف اہداف کو جو ترجیح حاصل رہی اب وہ تبدیل ہو چکی ہے۔ عالمی دہشت گردی کے خلاف مہم امریکہ کی خارجہ اور دفاعی پالیسی کا مرکزی نکتہ ہے اور دیگر عالمی اہداف اس وسیع ہدف کے زیر نگیں رہیں گے۔

مختصر مدت میں اس مہم کے دو اہم مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ القاعدہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ

پھینکا جائے اس کے لیے افغانستان پر حملہ بھی کیا جائے اور دیگر ممالک میں بھی اس کی شاخوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ افغانستان میں طالبان حکومت اس طرح تبدیل کی جائے کہ القاعدہ کی محفوظ پناہ گاہ کا خاتمہ ہو جائے اور دوسری حکومتوں کو یہ خاموش پیغام پہنچ جائے کہ اگر ان کی سرزمین سے امریکہ پر حملہ کرنے کی اجازت دی گئی تو ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔

طویل مدت میں امریکہ کو ایسے اقدامات کرنا چاہییں جس سے مزید القاعدہ وجود میں نہ آسکیں اور حقیقی دشمنوں کے لیے مزید مہلک ہتھیاروں (مثلاً جوہری ہتھیاروں) تک رسائی اور مشکل ہو جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے خارجہ پالیسی کا ارتکاز، (۱) دہشت گردی مخالف اتحاد کے انتظام (۲) تباہی کے ہتھیاروں پر کنٹرول بڑھانے (۳) افغانستان کی تعمیر نو اور (۴) عرب اور مسلم دنیا کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر ہونا چاہیے۔

اتحاد کا انتظام

جیسا کہ پہلے تجویز دی جا چکی ہے عالمی دہشت گردی کے خلاف کامیابی کی کنجی امریکہ کی اس صلاحیت میں پوشیدہ ہے کہ وہ ایک وسیع عالمی اتحاد وجود میں لے آئے اور اس کو برقرار رکھے۔ القاعدہ اور طالبان کے خلاف عسکری کارروائی کے لیے بین الاقوامی حمایت ایک بنیادی شرط ہے لیکن دور دراز تک پھیلے ہوئے القاعدہ کے جال کو بے دست و پا کرنے کے لیے دوسری ریاستوں کا تعاون بے انتہا اہم ہے۔ دیگر ممالک امریکہ کو جاسوسی پر مبنی اطلاعات ضرور فراہم کریں گے۔ دہشت گردی کے جال کو پروان چڑھانے کے لیے فراہمی حال کے نظام کو بے نقاب کرنے، اپنے ممالک میں امریکہ مخالف شدت پسندوں کو دبانے کے لیے وقت، وسائل اور سیاسی سرمائے کو استعمال کرنے پر بھی رضامند ہو جائیں گے۔

بدقسمتی سے اس اتحاد کو برقرار رکھنا آسان نہ ہوگا۔ چند عرب اور مسلم ممالک واشنگٹن کے ساتھ تعاون کرنے میں متامل ہیں۔ داخلی عدم استحکام کا خوف اور یہ مقبول رائے کہ امریکہ عرب اور مسلم معاملات کے بارے میں بے حس رہتا ہے، اس تامل کا سبب بنتے ہیں۔ امریکہ کے نام نہاد اتحادیوں کے درمیان بھی انتہائی سنجیدہ تنازعات ہیں (پاکستان اور بھارت کے درمیان معاملات ابلے پڑتے ہیں)،

جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان مسائل کا ابھار بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ تاریخ خبردار کرتی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف مہم وقت کے ساتھ ساتھ سرد ہو جائے گی جوں ہی اس مہم جوئی کی لاگت واضح ہوگی اور ابتدائی حملوں کا صدمہ پرانا ہونے لگے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امریکہ کے قریبی اتحادی آئندہ چند ماہ میں دولتی جھاڑ دیں خاص طور پر اس وقت جب امریکی درخواستوں کے ساتھ ساتھ حقیقی قربانی پیش کرنے کا مطالبہ بھی کیا جارہا ہو۔

وسیع البنیاد بین الاقوامی اتحاد کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے امکان ہے کہ امریکہ، خارجہ پالیسی کے دیگر اہداف کو اتحاد برقرار رکھنے کے وسیع تر منصوبے کے تابع کر دے۔ مختصر سے طویل دورانیے کے لیے درج مطابقات مناسب رہیں گے۔ اول، امریکہ پاکستان میں پرویز مشرف اور اس کی حکومت کی کوششوں کی حمایت کرے۔ افغانستان میں عسکری مہم کو آسان بنانے، کابل میں مابعد حکومت کے قیام کے لیے راستہ ہموار کرنے اور یقینی بنانے کے لیے اسلامی شدت پسند مشرف کو نکال باہر کر کے پاکستان کے جوہری اسلحے پر قبضہ نہ کر لیں۔ یہ پالیسی ضروری ہے۔ پابندیاں اٹھانا اور مزید امداد کا وعدہ (بشمول قرضوں میں سہولت) ایک معقول اولین قدم تھا لیکن پاکستان برآمدات کے لیے امریکی منڈی کو بھی کھول دینا چاہیے۔ اگر بھارت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ پاکستان کے ساتھ بامعنی مذاکرات کرے تو اس مشرف کو سیاسی طور پر مقبولیت حاصل ہوگی اور بہت سے اسلامی شدت پسندوں کے ساتھ قریبی تعلق رکھنے کے پاکستانی مفاد میں کمی واقع ہوگی۔

ثانیاً، چونکہ امریکہ کو بکثرت ایسے ممالک اور قوموں سے مدد کی ضرورت ہے ہے کہ جن کا انسانی حقوق کا ریکارڈ کمزور ہے مثلاً ازبکستان یا شمالی افغانستان کا اتحاد، دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ضرورت ہے کہ وقتی طور پر انسانی حقوق کے متعلق اپنے پیمانے کو نیچے لے جائے۔ لیکن اپنے نئے شرکاء کو یہ واضح کر دے کہ وہ ان کے سابقہ رویے سے صرف نظر نہیں کر رہا ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے تاکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ پالیسیاں بہتر ہو جائیں۔

ثالثاً، اس سانحے نے یہ مثالی موقعہ فراہم کر دیا ہے کہ روس کے ساتھ تعلقات بہتر بنا لیے جائیں۔ گزشتہ دہائی میں روس نے جن معاملات کے بارے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔ امریکہ نے ان کے

بارے میں معمولی سے احترام کا بھی مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اب اسے کئی محاذوں پر روس کی امداد کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے بش انتظامیہ کو یا تو نیٹو کی وسعت کے عمل کو چھوڑنا ہوگا یا اس کو اس انداز سے چلانا ہوگا جو روس کے قابل قبول ہو۔ روسی صدر ولادی میر پوٹن نے حال ہی میں اس کا اظہار کیا ہے کہ وسعت دینے کا معاملہ چند شرائط کے ساتھ قابل قبول ہوسکتا ہے لیکن بہت سے روسیوں کے لیے ابھی تک خطرے کی علامت سرخ جھنڈا بنا ہوا ہے اور دہشت گردی کے خلاف مہم کو آگے بڑھانے میں کچھ نہ ہو سکا۔ کم از کم وسعت کا معاملہ اس انداز میں طے ہونا چاہیے کہ اس میں روس کے اعتراضات کو بھی معقول مقام دیا گیا ہو یہ بھی امکان ہے کہ نیٹو کی ممبر شپ دینے کے لیے فوری طور پر روس کے لیے دروازے کھول دیے جائیں تاخیر سے نہیں۔ میزائل دفاع کے حوالے سے بھی امریکہ کو ایسی ہی پالیسی اختیار کرنا چاہیے۔ اور ۱۹۷۲ء کے Antiballistic Missile Treaty کے باہمی نظر ثانی شدہ پس منظر میں ایک ہی پالیسی اختیار کرنا چاہیے۔ ماسکو کے ساتھ بہتری کی طرف مائل تعلقات میں روسی معیشت کو مستحکم کرنے کے اقدامات سے اور روس میں جوہری ہتھیاروں کے خاتمے (denuclearisation) کے پروگرام کے لیے فراخدلانہ امداد سے ان تعلقات کو اور مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ امریکہ کو یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی عسکری موجودگی کو روس مشکوک وشبہات کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ امریکہ کو چاہیے کہ وہ ماسکو کو یقین دہانی کرادے کہ امریکہ روس کے صحن میں ایک نئے حلقۂ اثر کی تلاش میں نہیں ہے۔ رابعاً، اس سانحے سے امریکہ پر لازم آتا ہے کہ وہ دوسری اہم طاقتوں کے ساتھ پرسکون تعلقات استوار رکھے۔ چین نے خاموشی کے ساتھ دہشت گردی مخالف مہم کی حمایت کی ہے (جزوی طور پر کی ہے کیونکہ اس کو مغربی صوبوں میں اسلامی بے چینی (Islamic unrest) کا سامنا ہے) اور اس موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تائیوان جیسے امور کو اٹھانے کی کوششیں کی ہیں۔ یہاں امریکہ کے لیے معقول راستہ یہ ہے کہ بیجنگ اور تائیوان میں خاموش سفارت کاری کرے اور دونوں کو جان لینے دے کہ کسی ایک کی جانب سے اشتعال انگیزی امریکہ کے ساتھ تعلقات کو برباد کر کے رکھ دے گی۔

آخری بات یہ ہے کہ یہ امریکہ کی عقلمندی ہوگی کہ بیرونی امداد کے ردعمل میں خود بخود کچھ رعایتیں پیش کرے۔ امریکہ کیوٹو معاہدہ برائے عالمی حدت پذیری کی تبدیلی کے لیے سنجیدگی سے کوشش کرے، یہ

ایک مثالی اولین قدم شمار کیا جائے گا اور امریکہ کی یک سمتی کے بارے میں خدشات کم کرنے میں مدد دے گی۔ اسی طرح امریکہ ایک عالمی تجارتی دور کی تیاریوں کی کوششوں کو تیز تر کر سکتا ہے اور اس بات کا اعلان کر دے کہ امریکہ خصوصی طور پر تیسری دنیا کی برآمدات پر عائد پابندیوں میں نرمی کر رہا ہے چاہے اس کی بدولت اس کے چند مفادات داخلی طور پر متاثر ہوں۔ عالمی کساد بازاری کے دور میں ایسا اقدام مشکل ہو سکتا ہے، لیکن اب تجارت پر عائد پابندیاں کم کرنا بہت ضروری ہیں۔

اجتماعی تباہی کے ہتھیاروں پر کنٹرول

۱۱ ستمبر کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بین الاقوامی دہشت گرد ماہرین کے اندازے سے زیادہ باصلاحیت اور ظالم ہیں، اور یہ دہشت گرد اپنی جانیں قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں اور معصوم لوگوں کی ہلاکت پر بھی لاتعلق رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بدنما شگون یہ ہوگا کہ القاعدہ یا ایسی ہی کوئی اور تنظیم اجتماعی تباہی کا کوئی مہلک ہتھیار حاصل کر لے اور اس کو بھرپور قوت سے استعمال کر ڈالے۔ کون ایسا سنجیدہ فکر شخص ہے جس کو مغالطہ ہو کہ اسامہ بن لادن ایسے ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا اور اگر حاصل ہو گئے تو استعمال نہ کرے گا۔ اس خطرے کو کم کرنے کے لیے ایک تازہ کوشش کی ضرورت ہے کہ نیوکلیائی، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے ذخیروں کو قابل اعتماد کنٹرول میں دے دیا جائے۔ سب سے فوری اور واضح خطرہ روس میں ہے جہاں اجتماعی تباہی کے ہتھیاروں کا وسیع ذخیرہ ناقابل یقین حد تک کمزور نگرانی میں ہے۔

نیوکلیائی، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے تباہ کن ذخیرے دوسرے ممالک میں بھی موجود ہیں اور ان میں سے چند کی فراہمی اور نگرانی کا ناقص بندوبست ہے۔ اس لیے ''روس کے ڈھیلے'' جوہری ہتھیاروں کو کنٹرول کرنے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ایک عالمگیر مہم شروع ہونا چاہیے تاکہ دہشت گرد کسی اور ذریعے سے اجتماعی تباہ کاری کے ہتھیار حاصل نہ کر سکیں۔

اس اہم مقصد کے حصول کے لیے بش انتظامیہ کو جنوری ۲۰۰۱ء کی بیکر —— کنٹر رپورٹ ۲۰۰۱ء کی سفارشات کے نفاذ کی طرف تیزی سے بڑھنا چاہیے اور کانگرس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے کہ ماضی کی

نسبت زیادہ فنڈ سے ضروری پروگرام کا آغاز کردے۔ سابقہ سوویت یونین ریاستوں کی غیر جوہری بنانے اور روس کے ڈھیلے جوہری ہتھیاروں پر کنٹرول حاصل کرنے کے کام میں حقیقی پیش رفت ہوئی ہے لیکن مجموعی کوشش بدانتظامی، نوکر شاہی کی باہمی چپقلش، ریاست اور وفاق میں سے فنڈ کس کا ہوگا، سیاست، نیز صدارتی اور کانگرسی بے توجہی کے سبب سست رفتار ہی رہی۔ اگر یہ ہتھیار غلط ہاتھوں میں چلے گئے تو اس کا سبب یہ نیم دلانہ کوشش ہی بنے گی اور پالیسی ڈرامائی طور پر ناکام ہو جائے گی۔ اس سب کے باوجود نہ ہی بش انتظامیہ اور نہ ہی امریکی کانگرس نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اس مسئلے کی سنجیدگی سے آگاہ ہیں۔ اگرچہ سال ۲۰۰۰ء میں ہونے والے صدارتی انتخاب کی مہم میں اس کے وعدے کیے گئے تھے اور ۱۱ ستمبر کے واقعات نے پیدا ہو جانے کی گھنٹی بجادی ہے۔ انتظامیہ پاکستانیوں کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے جوہری اسلحہ کی زیادہ پر اعتماد انداز میں حفاظت کریں اس کے لیے انہیں مختلف افعال کو یک جا کرنے اور دیگر تکنیکی اقدامات کی اجازت دینا ہوگی تاکہ اس کا ناجائز استعمال نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی، امریکہ کو چاہیے کہ وہ ہمہ جہتی اسلحہ کنٹرول کے مشکل لیکن ضروری امر کے لیے کمر ہمت کس لے۔ اگر امریکہ اپنے رویے پر مُصر رہتا ہے تو دوسری ریاستیں اپنے اسلحہ کے ذخیروں کے معائنے کے طریق کار اور اپنے طرز عمل پر نئی پابندیاں برداشت نہ کریں گی۔ بش انتظامیہ Comprehensive Test Ban (CTBT) Treaty اور Inspection protocol of the Biological weapons convention کے بارے میں اپنا نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کرے اور فوری طور پر اس خواہش کا اظہار کردے کہ تباہ کن ہتھیاروں (WMD) تک دہشت گردوں کی رسائی روکنے کے لیے نئے انتظامات پر مذاکرات ہو سکتے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس طرز فکر سے بش انتظامیہ کو ہتھیاروں پر کنٹرول سے عدم رغبت ترک کرنا ہوگی۔ انتظامیہ نے دوسرے معاملات میں راستہ تبدیل کرنے کی قابل تعریف صلاحیت کا مظاہرہ کر دیا ہے اور امریکہ کی سرزمین پر براہ راست حملے نے یہ احساس ابھار دیا ہے کہ اس کے بارے میں تازہ غور و فکر ہونا چاہیے۔ القاعدہ کے حملوں نے یہ بتا دیا ہے کہ تباہ کن ہشت گردی کا خطرہ اس سے زیادہ سنگین ہے جتنا کہ ماضی میں سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ ایک نادر موقعہ ہے کہ اجتماعی تباہی کے ہتھیاروں کو

محدود کرنے کے لیے بڑی کوشش کا آغاز کر دیا جائے۔ اگر امریکہ عالمی دہشت گردی کے خطرے کو محدود کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے تو اس کی سترتیجی میں ایسے گروہوں کی مہلک ہتھیاروں تک رسائی کا راستہ روکنا ایک اہم مشق کے طور پر شامل رہنا چاہیے۔

ناکام ریاست

صدارت کے امیدوار کے طور پر جارج ڈبلیو بش نے بار بار کلنٹن انتظامیہ کی ''قومی تعمیر'' کی کوششوں پر تنقید کی۔ امریکہ پر حملوں کے ایک ماہ کے اندر بش انتظامیہ کھلے عام تسلیم کر رہی تھی کہ طالبان حکومت کو ختم کرنے کی مہم میں انہیں ایک قابل عمل افغان حکومت وجود میں لانے اور جنگ سے تباہ حال ملک کی تعمیر نو کی کوشش کرنا ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ''قومی تعمیر'' اس قدر بُرا خیال بہر حال نہیں۔

جیسا کہ پہلے بحث کی جا چکی ہے پالیسی میں تبدیلی سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ افغانستان جیسی ناکام ریاستیں امریکہ دشمن انتہا پسندوں کے لیے مراکز تخلیق اور مقام محفوظ بن جاتی ہیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ افغانستان کی موجودہ صورت حال کے لیے امریکہ بھی جزوی طور پر ذمہ دار ہے۔

۱۹۸۹ء کے بعد جب روسی افواج افغانستان سے جا چکی تھیں، افغانستان کی تعمیر نو میں امریکہ کی ناکامی نے افغان معاشرے کے ردعمل کو پروان چڑھایا اور اس کے نتیجے میں طالبان کو کامیابی ملی۔ اب طالبان کی شکست کے بعد اگر امریکہ اپنی غلطی کو دوبارہ دھراتا ہے، امکان ہے کہ مزید بن لادن ظہور پذیر ہو جائیں۔ افغانستان سے لاحق ہونے والی طویل مدتی دہشت گردی کو قلیل مدت میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افغانستان میں تعمیر نو کا کام کیا جائے اور یہ ناقابل مفر ذمہ داری ہے۔

عرب اور اسلامی دنیا کے ساتھ تعلقات کی استواری

عرب اور اسلامی دنیا نے القاعدہ کے حملوں کے بعد امریکہ کے ابتدائی عسکری اقدام پر جو ردعمل ظاہر کیا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان معاشروں میں امریکہ اجنبی بن چکا ہے۔ اگرچہ کئی عرب اور مسلمان قائدین نے فوری طور پر حملے کی مذمت کی اور بن لادن کی اپیل کہ نیا جہاد (مقدس جنگ)

شروع کیا جائے کو رد کر دیا تاہم عرب اور مسلم رائے عامہ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کی شدید ناقد رہی ہے۔ ان رویوں سے جدیدیت پسند عرب حکومتوں کے لیے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حمایت کریں اور اس کا امکان بن جاتا ہے کہ القاعدہ کے خلاف مہم چلانے سے القاعدہ کے نئے حامی پیدا ہو جائیں۔ عرب اور اسلامی حکومتیں امریکی کوششوں کی حمایت کے عمل کو کم پر خطر سمجھیں اور امریکہ مخالف انتہا پسندوں کو اپنے ممالک میں یکہ و تنہا کر دیں۔ امریکہ کو چاہیے کہ ان ممالک کے عوام اور معاشروں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرے۔ کو طویل مدت کے لیے امریکہ صرف عرب حکمرانوں کی دوستی پر بھروسہ نہیں کر سکتا، اس کے بارے میں اتنی بڑی آبادی کا تصور بھی بہتر ہونا چاہیے۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جو خلفشار چل رہا ہے اس پر یک طرفہ لائحہ عمل اختیار نہ کیا جائے۔ اس لکیر پر بش انتظامیہ جوں کی رفتار سے چل رہی ہے۔ امریکہ اتنی شدت کے ساتھ اسرائیل نواز نہیں ہے جیسا کہ بہت سے عربوں کا خیال ہے لیکن ماضی میں اس کی پالیسیاں برابری پر مبنی بھی نہیں رہی ہیں۔ یہ اصرار اسرائیل کے تحفظ کی ناقابل تبدل پالیسی (جو اسے ۱۹۶۷ء سے پہلے کے رقبے تک محدود رکھتی ہے) کے ساتھ ساتھ امریکہ کو یہ دوٹوک واضح کر دینا چاہیے کہ نئی نئی بستیوں کی تعمیر کے ذریعے اسرائیل نے وسعت پذیری کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے امریکہ اس کا شدید مخالف ہے اور یہ پالیسی امریکہ یا اسرائیل کے طویل مدتی مفادات سے متصادم ہے۔ فلسطینی ریاست کی ضرورت کے حوالے سے امریکہ کو اپنا واضح موقف لانا چاہیے اور اس امر پر زور دینا چاہیے کہ ایک قابل عمل ریاست کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ اسرائیل جولائی ۲۰۰۰ء میں کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر پیش کی جانے والی تجاویز سے آگے بڑھے اور فراخدلانہ، عزم حالات کار ممکن بنائے۔ خاص طور پر اسرائیل کو چاہیے کہ جون ۱۹۶۷ء میں اس نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا مکمل امن کے بدلے میں انہیں خالی کر دے۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں طبا کے مقام پر ہونے والے ناکام مذاکرات نے ثابت کر دیا کہ ایک آخری فیصلے سے پہلے موقع باقی ہے لیکن وہاں جو پیش رفت ہوئی، افسوس ناک حد تک اس میں تاخیر ہوئی۔

امریکہ کے مقام و مرتبے کو اپنے محل پر رکھنے کے لیے محتاط اور چوکس سفارت کاری کی ضرورت ہے تاکہ امریکہ نہ دہشت گردوں کے دباؤ کے آگے جھکتا ہوا محسوس ہو، نہ ہی اہم قومی اقدار کو قربان کرنے۔

دوسرے امور کے علاوہ امریکہ کو اس کی نشان دہی کرنا چاہیے کہ امریکی قائدین نے فلسطینی ریاست کے قیام کی حمایت، ۱۱ستمبر سے بہت پہلے کی تھی اور اس ریاست کو وجود میں لانے کے لیے کلنٹن انتظامیہ نے قابل ذکر کوششیں کی تھیں۔ امن مذاکرات (peace process) کو ازسرنو شروع کرنے کے لیے امریکہ کو چاہیے کہ وہ اسرائیل کو مجبور کرے کہ وہ مچل کمیشن کی سفارشات کو قبول کرلے (علاوہ ازیں اضافی یہودی بستیوں کی تعمیر روک دے) اور دونوں اطراف کی حوصلہ افزائی کرے کہ وہ اسی نکتے سے مذاکرات کا دوبارہ آغاز کریں جس پر جنوری ۲۰۰۱ء میں سلسلہ ٹوٹا تھا۔

تشدد کی موجودہ لہر اور ۲۰۰۱ء کے بعد اسرائیلی اور فلسطینی لیڈروں کے باہمی قتل عام کے بعد ان تدابیر سے کوئی معاہدہ بذاتِ خود برآمد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس طریقے سے عالم عرب اور امریکہ کے درمیان سے ایک رکاوٹ دُور ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں انتہا پسندوں کے امریکہ کے خلاف جو بڑے الزامات ہیں ان میں سے ایک زائل ہو جائے گا۔ عربوں اور مسلمانوں کے ذہنوں میں امریکہ کا منفی تصور ہمیشہ کلبلاتا رہتا ہے اس لیے ممکن نہیں ہے کہ امریکہ چند صدارتی بیانات کے ذریعے ماضی کی تمام پالیسیوں کو بدل دے۔ امریکہ کو ایک اصولی موقف اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا ہوگا چاہے یہ کتنا ہی طویل اور دقت طلب محسوس ہو۔ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی نقطہ نظر کو زیادہ مبنی برحقیقت بنانے کے لیے امریکہ کو کئی عرب حکومتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کا ازسرنو جائزہ لینا ہوگا۔ امریکہ روایتی بادشاہوں مثلاً سعودی حکمرانوں کی پشت پناہی کرتا چلا آ رہا ہے جبکہ سعودی عرب تبدیلی پسند عناصر کو دیگر ممالک میں امداد بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ ممالک اگرچہ اندرونی طور پر خلفشار کو روکے ہوئے ہیں اور امریکہ کی سفارتی کوششوں کی کھلم کھلا حمایت کرنے سے بھی گریزاں رہتے ہیں۔ تیل کی دستیابی میں دلچسپی کے باعث امریکہ ان ممالک میں کثیر جماعتی نظام کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ مبادا یہاں کا نظام تبدیل ہو جائے اور یہاں کے لوگ امریکہ کے کھل کر اور زیادہ مخالف ہو جائیں۔ امریکہ کی یہ بھی کوشش ہونا چاہیے کہ بحیرۂ فارس میں اپنی عسکری موجودگی میں کمی کرے اور اردگرد کی حکومتوں کو موقع دے کہ وہ عوام الناس پر سیاسی شرکت کے دروازے کھول دے۔ امریکہ اسلامی دنیا کو ''جمہوریت سے پاک علاقہ'' سمجھنا چھوڑ دے جہاں اسلامی تحریکات بامعنی سیاسی شرکت سے مسلسل محروم رکھی جا رہی ہیں۔ اگر اسلامی عناصر، سیاست میں کھلم کھلا حصہ نہ لے

سکے، تو وہ پرتشدد تبدیلی کے طریقے اختیار کریں گے۔ اگر دوسرے معاشرتی گروہوں کے ساتھ اسلامی تحریکات کو شرکت کا موقع دیا گیا تو اس کا امکان ہے کہ وہ اپنے معاشروں کے اندر ایک مثبت قوت بن جائیں گے۔ ایسی پالیسی اختیار کرنے کے خطرات ہیں لیکن ایسے ہی خطرات امریکہ کے ان خودمختار آمروں پر انحصار سے بھی لاحق ہوتے ہیں جو کہ اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔

آخری بات امریکہ کو ضرورت ہے کہ عرب اور مسلمان آبادیوں کے ساتھ دنیا بھر میں براہ راست ربط و تعلق استوار کرے۔ عربوں اور مسلمانوں کی نفرت امریکہ کے چند خاص اقدامات کا ردعمل ہے لیکن اگر اس کو امریکہ دشمن حکومتوں اور گروہوں نے الزامات اور اعتراضات کی بھرمار سے بھڑکا دیا ہے۔ مثال کے طور پر بہت سے عرب یقین رکھتے ہیں کہ عراق کے خلاف عائد پابندیوں کی وجہ سے ہزاروں عراقی ہلاک ہو چکے ہیں (اور ان میں سے اکثر بچے تھے)، وہ اس سے ناواقف ہیں کہ ان ہلاکتوں کا سبب صدام حسین کا جابرانہ رویہ ہے جس نے ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۶ء کے عرصے میں اقوام متحدہ کے تیل ــــ برائے ــــ خوراک پروگرام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بعد میں اس پروگرام کا حشر نشر ہو گیا تھا۔ اسی طرح امریکہ ان کوششوں کا سہرا اپنے سر کم ہی باندھتا ہے جو اس نے بوسنیا، کوسووا، صومالیہ اور شمالی عراق میں مسلمانوں کی امداد کے ذریعے کی ہے یا اسرائیل، مصر، اردن اور فلسطینیوں کے لیے قیام امن کی راہ ہموار کی ہے۔ جو اشارے ہم نے اس مضمون میں دیے ہیں اگر ان کو نظرانداز کیا جاتا ہے یا ان کو غلط سمجھا جاتا ہے تو علاقے میں امریکہ کی پالیسیاں متعین کرنے کا فائدہ کم ہی ہوگا۔ نیز امریکی پالیسیوں کے لیے فضا ہموار کرنے کا کام دوبھر ہو جائے گا۔ اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے امریکہ کو چاہیے کہ ایک وسیع البنیاد عوامی اطلاعاتی مہم کا آغاز کرنے اور اس کے لیے ہر چینل اور ذریعے کو بروئے کار لائے۔ ایسے سفارت کار اور ترجمان بڑی تعداد میں تربیت کیے جائیں کہ جو ان لوگوں اور ان آبادیوں سے موثر انداز میں بات کر سکیں اور جب بھی ان کی ضرورت ہو، میڈیا پر انہیں پیش کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر الجزیرہ ہے (قطر سے پروگرام کرنے والا اطلاعاتی نیٹ ورک، جس کے عالم عرب میں ساڑھے تین کروڑ ناظرین ہیں)۔ اس علاقے میں امریکہ کو عربی زبان کے پروگراموں کی نشریات میں بھی اضافہ کرنا چاہیے تاکہ مقامی آبادیاں صرف سرکاری خبروں پر ہی انحصار نہ کریں۔ ان ممالک میں انٹرنیٹ کا استعمال تیزی کے ساتھ بڑھ رہا

ہے۔عربی زبان کی ویب سائٹوں کے ذریعے ان کے استعمال کنندگان تک براہ راست پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کا سادہ لفظوں میں مطلب یہ نہیں ہے کہ امریکہ کی حمایت میں پراپیگنڈا کیا جائے (ایسا کیا گیا تو اس کا وزن نہ ہوگا)۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دوسری آبادیوں کو کیا بتایا جا رہا ہے اس کی مانیٹرنگ ہو اور ان کو جن حقیقی معلومات کی ضرورت ہے وہ فراہم کی جائیں۔

آخری اندیشہ

اوپر جس ایجنڈے کے خطوط وضع کیے گئے ہیں اس میں کئی امیدیں شامل ہیں۔ افغانستان (اور دیگر جگہوں میں) میں اپنے عسکری اقدامات کی اعانت کے لیے امریکہ نے پاکستان اور ازبکستان میں سلامتی کی نئی ذمہ داریاں مول لے لی تھیں۔ اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے اور عرب دنیا سے تعلقات کی استواری کے لیے امریکہ کی ضرورت ہوگی کہ وہ اسرائیل اور فلسطینیوں کو رضامند کرے کہ ایک سال کے خونی تشدد کے بعد ایک دوسرے کو رعایت دے دیں۔ مشرف حکومت کو استحکام بخشنے اور اسے اسلامی انتہا پسندوں سے تعلقات منقطع کرنے کے لیے، واشنگٹن کے لیے ضروری ہوگا کہ مشرف کی اقتصادی امداد کرے۔ اور کشمیر پر حقیقی مذاکرات کے لیے دباؤ ڈالے۔ کشمیر ایک ایسا جھگڑا ہے کہ جس کی قرارداد کو پچاس برس سے پسِ پشت ڈالا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ جب طالبان کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے، امریکہ کو چاہیے کہ وہ افغان ریاست میں تعمیر نو کا کام سنبھال لے جو غربت زدہ ہے اور جس کے بارے میں اس کا سابق تجربہ موجود نہیں ہے۔ دہشت گردی کو جاری وساری رکھنے والے اقتصادی مصادر کو منقطع کرنے کے لیے دیگر حکومتوں اور غیر ملکی مالیاتی اداروں پر دباؤ برقرار رکھنا پڑے گا۔ اجتماعی تباہی کے ہتھیاروں کو دہشت گردوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک طویل سفارتی مہم اور بہت مشکل مفاہمتیں کرنا پڑیں گی۔ ان میں سے کس ایک ہدف کو پورا کرنا بھی کار دارد ہے، پورے ایجنڈے کی وکالت کرنا یوٹوپیا (خیالی ریاست) جیسا محسوس ہوگا۔ لیکن یہ تمام اقدامات دہشت گردی کے واضح کردہ خطرات سے نمٹنے کا تسلسل ہیں اور وہ پیمانے ہیں جس سے امریکہ کی مستقبل میں کارکردگی کو ماپا جا سکتا ہے۔

ایک حتمی خطرہ بھی ہے، جب امریکہ سے کہا جائے گا کہ وہ زیادہ قوت کے ساتھ معاملات عالم

خصوصاً مشرقِ وسطیٰ اور وسطی ایشیا میں سرگرم ہو، تو دہشت گردی کی روک تھام کے ساتھ ساتھ یہ امکان بھی تو موجود ہے کہ ایسی ہی مزاحمت پھر اور پیدا ہو جائے جیسا کہ القاعدہ کی صورت میں ایک بار سامنے آ چکی ہے۔ اس کام میں جتنا زیادہ وقت صرف ہوگا اور دوسرے ممالک کے معاملات میں امریکہ جس قدر مداخلت کرے گا اتنا ہی اس کا امکان ہے کہ بعد میں اتنا ہی بڑا مخاصمانہ ردعمل سامنے آ جائے۔ یہ اندیشہ آخری مسئلہ ابھار رہا ہے۔ کیا یہ پالیسیاں طویل مدت تک برقرار رکھی جا سکتی ہیں؟

اگلی بحث: مداخلت یا پسپائی؟

امریکہ کی خارجہ پالیسی کے جو بنیادی اصول ہیں ان پر عوامی مباحثہ ۱۱ ستمبر کے بعد کافی دھچکا پڑ چکا ہے۔ فوری طور پر جو خطرہ لاحق ہوا، اس کا مقابلہ کرنے پر اختلاف رائے ہوا لیکن چند ایک امریکی ہی ہوں گے جنہوں نے بھرپور ردعمل یا دنیا میں دوررس امریکی کردار کے از سرنو تعین کی ضرورت پر زور دیا ہو کیونکہ یہ مہم چل رہی ہے اس لیے ان بنیادی امور کا سر اٹھانا لازمی ہے اور امریکہ کی وسیع تر تیجی کے بارے میں ایک سلگتی ہوئی بحث کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ عالمی عسکری وعدوں کے موجودہ سلسلے کو خصوصاً اگلے مورچوں پر فوجوں کی موجودگی کو —— یا اپنے پہلے مقام تک واپسی کو امریکہ ''سمندر پار توازن'' کے طور پر برقرار رکھے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں امریکہ نے یورپ اور ایشیا میں بڑی بڑی افواج تعینات کر رکھی ہیں اور افواج امریکہ حقیقی معنوں میں دنیا کے ہر کونے میں سرگرم عمل ہیں۔ سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ جدوجہد کا نقطۂ آغاز بھی یہ پالیسی بنی۔ اس کے پیچھے یہ نظریہ بھی کارفرما ہے کہ امریکی مداخلت سے یورپ اور ایشیا میں امن کا قیام سازگار رہتا ہے۔ غیر دینی اقدار کے فروغ میں معاونت ہوتی ہے اور ایک آزاد منڈی کی معیشت برقرار رکھنے کو استقرار مل جاتا ہے۔ یہی کارفرما نظریہ ہے جس کی وجہ سے سوویت یونین کے زوال کے باوجود امریکہ نے سرد جنگ کے اپنے حلیفوں کو الوداع نہ کہا بلکہ وسطی یورپ، بلقان اور بحر فارس میں اضافی ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے لیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے، اس پالیسی کے اختیار کرنے کی اس سے کہیں زیادہ لاگت آئے گی جتنا

کہ امریکیوں نے سوچا ہوگا۔ وہ انسانی جانیں ہیں جن کا اتلاف ہو چکا ہے۔ ملک کے اندرونی دفاع کے لیے زیادہ وسائل کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی خود ساختہ ذمہ داریوں میں سے کچھ کمی کی ضرورت ہے تاکہ سانس تو آسکے، اب جبکہ دہشت گردی کے خلاف مہم کا آغاز ہو چکا ہے، امریکی یہ دریافت کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس مہم پر جس قدر توجہ دی جا رہی ہے کیا وہ اس کا مستحق ہے، کچھ امریکی یہ سوال ضرور پوچھیں گے کہ امریکہ اس مہم میں اتنا آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لے بھی سکے گا یا نہیں؟ کیونکہ امریکہ اتنے ہی جوش و جذبہ کے ساتھ دیگر معاملات دنیا چلانے میں بھی مستغرق ہے۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ دب جائیں گی اگر موجودہ مہم کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے اور اس مختصر مدت کی مصروفیت کی انہیں اگر زیادہ لاگت نہ دینا پڑی۔ اگر یہ مہم کمزور رہی اور القاعدہ یا اس جیسے اور گروہ اس سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گئے جتنا کہ گمان جاتا ہے تو یہ دباؤ ڈالا جائے گا کہ اس مہم کو بند ہی کر دیا جائے۔

امریکہ کی خارجہ پالیسی کے لیے اس کی معنویت کیا ہوگی۔ یہ کہ امریکہ کی صلاحیت کہ عالمی معاملات میں سرگرمی سے ایک ایسی قیمت پر حصہ لینے کا دارومدار اس پر ہوگا کہ وسائل بھی کم استعمال ہوں اور اس کا مقام و مرتبہ بھی بقیہ دنیا کے نزدیک اور بڑھ جائے۔ طویل مدتی منصوبہ بندی کے لیے پالیسی اور رویہ میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی؟

اول، امریکہ کو چاہیے کہ ہمہ جہتی اداروں پر بہت زیادہ انحصار کرے چاہے اس کی بدولت اس کے دائرہ عمل میں مختصر مدت کے لیے کمی ہی کیوں نہ ہو جائے، ادارے اس لیے اہم نہیں ہیں کہ وہ سرکاری طرز عمل کے اوپر طاقت ور رکاوٹ بن سکتے ہیں (جو کہ وہ نہیں ہیں) بلکہ اس لیے کہ اس طرح بین الاقوامی مداخلت کے الزام میں کمی کرا دیتے ہیں اور امریکہ مخالف ردعمل کا خدشہ نسبتاً کم ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں اقوام متحدہ اور دیگر اداروں کے ناقدین کی توجہ عموماً ان پابندیوں پر رہتی ہے جو یہ ادارے نافذ کر سکتے ہیں۔ اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ غیر معمولی، غیر ملکی دباؤ انگیخت کیے بغیر، امریکہ ان اداروں کے ذریعے سے اپنے اہداف حاصل کر سکتا ہے۔

دوم، دوسری ریاستوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے امریکہ کو چاہیے کہ زیادہ فراخ حوصلے اور مہربانی سے کام لے۔ امریکہ کے پاس بے انتہا دولت، طاقت اور ایک مناسب جغرافیائی حدود اربع ہے۔

بالکل فطری بات ہے کہ دوسری ریاستیں اس کے وسائل اور خوشحالی کے راستے میں ہونے لگیں۔ خصوصاً اس وقت کہ جب یہ خودغرض، خود پسند اور متکبر ہو جائے۔ جب صدر بش یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم کیوٹو معاہدے کو اس لیے رد کر رہے ہیں کیونکہ یہ امریکی عوام کے مفاد میں نہیں اور اس معاہدے پر دستخط کرنے سے امریکی مفاد کو نقصان پہنچے گا اسی طرح جب امریکہ ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدے (Arms cotrole treaty) کی صرف اس لیے نفی کر دیتا ہے تاکہ اپنے ملک میں کچھ فوائد حاصل کیے جاسکیں تو ایسے موقعوں پر امریکہ مطلب پرست، خودغرض اور غیر معاملہ فہم محسوس ہوتا ہے۔

جب واشنگٹن داخلی گروہوں (lobbies) کے آگے جھک جاتا ہے اور ٹیکسٹائل کی درآمد سے پابندی اٹھانے کے ابتدائی معاہدوں سے پھرنے لگتا ہے (جس کی وجہ سے تیسری دنیا کے ممالک کے لیے بہت مشکل آئی ہے) تو امریکہ انتہائی غیر ذمہ دار اور طوطا چشم محسوس ہوتا ہے۔ اگر امریکہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی ''بڑے صاحب'' کی پوزیشن برقرار رہے اور اس کو تسلیم کرنے میں دوسروں کو بھی آسانی رہے تو اس کو اپنی دولت اور اپنی طاقت کو اس طرح استعمال کرنا ہوگا کہ اس کا اپنے مفادات کی قطع و برید نہ ہو اور دوسروں کے مفادات بھی محفوظ رہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ امریکہ کو چاہیے کہ علاقائی سلامتی کی خودساختہ ذمہ داریاں کم کرنے کا آغاز کر دے تاکہ دیگر ریاستیں یا تنظیمات اسے سنبھال لیں اور آہستہ آہستہ اپنی نمایاں عسکری موجودگی کو کم کر دے۔ بش انتظامیہ چاہتی تھی کہ ۱۱ ستمبر سے پہلے اس سمت میں پیش قدمی کرے اور ایسی علامات موجود ہیں کہ جیسے ہی موجودہ مہم جوئی ختم ہوئی اس راستے پر دوبارہ آنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر بلقان سے فوجی دستے اس دلیل پر واپس بلائے جا سکتے ہیں کہ افغانستان کی جنگ میں ان کی ضرورت پڑے گی۔ اور یہ دستے اس وقت تک بلقان واپس نہ آئیں گے جب تک افغانستان کا مسئلہ سلجھ نہ جائے۔ اس اقدام سے یہ پیغام پہنچے گا کہ امریکہ یورپ کے دفاع کی ذمہ داری اہل یورپ کو دوبارہ سونپ رہا ہے۔ یہ امریکہ کی تنہائی کی طرف پیش رفت نہ ہوگی بلکہ اپنی نمایاں عسکری موجودگی کو پیچھے لا کر عالمی ردعمل میں کمی کرا سکیں گے۔ اس طرح دوسری ریاستوں کو بھی موقع مل جائے گا کہ اپنی آزادی سے اپنے لیے راستہ طے کریں۔ یہ سارا عمل آہستہ آہستہ ہوگا لیکن عالمی سیاست کے نئے ڈھانچے میں یہ ایک دانشمندانہ طویل مدتی پالیسی